(غلام گردش)

صادقین

دس فروری 1987 کوکراچی کے چھوٹے سے ہسپتال نما کلینک میں ایک شخص آخری سانسیں لے رہا تھا۔ بزرگ کے ساتھ لواحقین میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک تیماردار بہر حال موجود تھا۔ رشتہ دار تھا یا دوست، قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ تیماردار بڑے غور سے مرتے ہوئے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ شائد اسے یقین تھا کہ اب یہ مریض چند لمحوں یا گھنٹوں کا مہمان ہے۔ جیسے جیسے بستر پر پڑے ہوئے مہذب انسان کی آنکھوں سے زندگی کی روشنی ختم ہو رہی تھی، ویسے ویسے تیماردار کی آنکھوں میں چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ دو بجے کے ذرا سے بعد زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ تیماردار گزشتہ کئی گھنٹوں سے اسی گھڑی کا منتظر تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر یا نرس کو بتانے کی زحمت نہیں کی۔ کلینک کے باہر اپنی سوزوکی ویگن میں بیٹھا اور خاموشی سے فریرے ہال چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر جتنی تصویریں اُٹھا کر ویگن میں بھر سکتا تھا، بھریں۔ بعد ازاں واپس ہسپتال کے کمرے میں آ گیا۔ سفید بالوں والا شخص آرام سے آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ سانسوں کے بغیر۔ تیماردار نے واویلا مچا دیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا کہ پاکستان کا سب سے بڑا مصور مر چکا ہے۔ ڈاکٹر بھاگے بھاگے آئے، کمرے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا ہجوم ہو گیا۔ معالجین نے معائنہ کے بعد بوجھل دل سے بتایا کہ یہ شخص زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ دنیا سے جانے والا شخص صادقین تھا۔ فریرے ہال سے چرائی جانے والی تصاویر بڑے آرام سے بلیک مارکیٹ میں سالہا سال بکتی رہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ، اور سرمایہ دار اپنے گھروں اور دفاتر میں چوری کی یہ تصاویر آج بھی بڑے فخر سے لوگوں کو دکھاتے ہیں یہ وہ حسنِ سلوک ہے جو "ہم" نے پاکستان کے عظیم ترین مصور اور خطاط کے ساتھ روا رکھا۔ صادقین مرتے وقت صرف چونسٹھ برس کا تھا۔ کالم لکھتے ہوئے یعنی 30 جون، صادقین کا پیدائش کا دن ہے۔

صادقین کا کون نہیں جانتا۔ معدودے چند بڑے لوگ جو ہمارے ملک کی پہچان بنے۔ صادقین ان میں سرِ فہرست ہے۔ صادقین کا تعلق امروہہ کے جس خاندان سے تھا، اس میں بہترین خطاط موجود تھے۔ پاکستان آنے کے بعد اس شخص نے جب تصویریں بنانی شروع کیں، تو کسی نے بھی اسکے کام پر توجہ نہیں دی۔ گمنامی کے یہ سال اتنے بڑے شخص کیلئے کتنے اذیت ناک ہونگے، اسکا صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ آپ شائد حیران ہونگے کہ صادقین کراچی میں اپنے فن پاروں کی نمائش کرنے میں ابتدائی طور پر مکمل ناکام رہا۔ 1954 میں کوئٹہ میں کام کی پہلی نمائش منعقد کی گئی۔ اس بڑے شخص کو پہلی پذیرائی کوئٹہ میں حاصل ہوئی۔ کیا 2017 کے پاکستان میں تصور کیا جا سکتا ہے کہ چھ سات دہائیوں پہلے کا کوئٹہ ایک فن شناس شہر تھا۔ پُرسکون اور خوبصورت۔ اتنا محفوظ کہ اس شہر کی سڑکوں پر لڑکیاں آرام سے سائیکل چلاتی تھیں۔ قہوہ خانوں اور برف کی دبیز تہوں سے بھرپور زندہ شہر۔ آج اس شہر کا کیا حال ہے۔ اس پر نوحہ لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہر ایک کے علم میں ہے کہ اس نایاب شہر میں زندگی کو کیسے کم یاب کیا گیا ہے۔ اب یہ بم دھماکوں، خون ریزی، دہشت گردی اور قتل و غارت سے لہولہو ہو چکا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا، جب اس شہر سے کوئی منفی خبر اعصاب پر تلوار کی طرح وار نہیں کرتی۔ 1954 کا کوئٹہ کمال شہر تھا۔ صادقین کو لوگوں کے سامنے لانے والا عظیم شہر۔

ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کسی قسم کے بھی فنکار، صداکار، قلم کار، شاعر یا مصور ہوں، سرکاری مدارات کے بغیر پنپ نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے کے حکمران تمام صاحب ہنر لوگوں کو دربار میں بلند مقام پر رکھتے تھے۔ انکی ضروریات زندگی کو پورا کرتے تھے۔ بات بات پر انہیں انعام واکرام سے نوازتے تھے۔ مقصد صرف ایک تھا کہ فنکار معاشی تنگدستی کا شکار نہ ہوں۔ فکر معاش میں اپنے ہنر کو بھول نہ جائیں۔ اگر آج ہم آرٹ کے کسی بھی شعبے میں بڑے ناموں سے محروم ہیں تو اسکی بہت بڑی وجہ حکومت کی اس اہم ترین شعبہ میں عدم دلچسپی ہے۔ انتہائی ہنرمند لوگ بھی روزگار کی تلاش میں دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی انکے لیے اس درجہ اہم ہوتی ہے کہ انکا فن زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ یہ رویہ بھی بالکل درست ہے۔ انسان اگر معاشی طور پر آسودہ حال نہ ہو، تو وہ کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ تخلیقی صلاحیتیں صلب سی ہو جاتی ہیں یا شائد زنگ آلود۔ صدیوں پہلے جو نکتہ حکمران جانتے تھے، وہ اب مکمل طور پر فراموش ہو چکا ہے۔ نتیجہ ایک زنگ آلود معاشرہ ہے جو تخلیقی طور پر مکمل طور پر بنجر ہے۔ بغیر کسی سبزے اور خوبصورتی کے۔ صادقین اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ حسین شہید سہروردی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ یہ بات بھی شائد اب ایک کہانی سی لگتی ہے۔ کوئٹہ کی کامیاب نمائش کے بعد صادقین نے 1955 میں جناح ہسپتال کراچی میں ایک خوبصورت فن پارہ تخلیق کیا۔ اس وقت کا شرفاء کا دور تھا۔ حسین شہید سہروردی نے صادقین کے کام کو دیکھا تو اس عظیم شخص کا گرویدہ ہو گیا۔ صادقین نے سہروردی کے گھر کیلئے بھی کمال فن پارے تخلیق کیے اور انکی رہائش پر اسکی نمائش بھی منعقد ہوئی۔ یہ وہی سہروردی تھے جو پاکستان کے وزیراعظم بھی رہے۔

صادقین سادہ انسان تھا۔ اپنے کام کو کسی بھی سیٹھ کو بیچنے کے بہت خلاف۔ زندگی میں اس عظیم فنکار نے اپنا کام نجی لوگوں کو بہت کم فروخت کیا۔ بنیادی طور پر اسکی سوچ آفاقی تھی۔ وہ تخلیقی کیفیت کو چھوٹے سے کینوس کے حصار میں نہیں لا سکتا تھا۔ سچ کی تلاش میں اسکے کام میں تہذیب اور انسان کے ارتقاء کا سفر غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ جھلک ہر کام میں نظر آتی ہے۔ ایک بار صادقین سے پوچھا گیا کہ پھول، تتلیاں اور قدرتی مناظر کو کیوں نقشِ تصویر نہیں کرتے۔ جواب ہمہ گیر حیثیت کا تھا۔ "میں سچ کی کھوج میں رہتا ہوں۔ دبیز پردوں اور گلاب کے پھولوں میں کچھ بھی ایسا نہیں کہ انکی طرف توجہ دی جائے۔ میرا موضوع تو وہ بھوکا انسان ہے جو سارا دن روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے محنت کرتا ہے۔ جو طمانیت اس شخص کے چہرے پر تھوڑی دیر کیلیے شام کو اپنی محنت کی روٹی کھانے سے آتی ہے۔ وہی میرے ذہن کیلئے مہمیز بنتی ہے۔ میں صرف اور صرف حقیقت کے قافلہ کا مسافر ہوں"۔

صادقین نے اپنی زندگی میں ہزاروں فن پارے تخلیق کیے۔ خطاطی کے فن کو اس درجہ بلند کر دیا کہ پاکستان تو کیا، پوری دنیا میں لوگ حیران رہ گئے۔ منگلا ڈیم جانے کا اتفاق ہو۔ آپ پاور ہاؤس کی چھت دیکھیے۔ صرف تین مہینے کی قلیل مدت میں صادقین نے دو سو فٹ طویل اور تیس فٹ چوڑا "میورل" بنایا۔ دن رات کام کرتا رہا۔ یہ کام حیرت انگیز ہے۔ انسانی محنت اور محنت کش کی لازوال داستان۔ ایسی تخلیق جو کبھی بھی معدوم نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی عرض کرتا چلوں، کہ صادقین کام کرتے ہوئے بھوک، پیاس اور آرام سے بہت دور ہوتا تھا۔ "دخترِ رز" کے سہارے صوفی حالت میں کئی کئی دن بغیر رکے ہوئے کام کرتے چلا جاتا تھا۔ عجیب مزدور سا شخص تھا۔ کسی انعام واکرام سے بے نیاز۔ صرف پاکستان ہی کیا پوری دنیا نے اس شخص کے کام کو سراہا۔ پیرس میں شہرہ آفاق ناول " The

stranger کونقش کا روپ دینے والا صرف اور صرف صادقین تھا۔شاعری پر گہری نظر رکھنے والے شخص نے غالب،فیض اور اقبال کے اشعار کو خطاطی اور تصویری رنگ دیدیا۔ یہ لازوال کام حیران کن حد تک خوبصورت اور اچھوتا ہے۔شاعری کو لازوال بنانے والا انسان اپنی زندگی میں بذات خود بہت بڑا شاعر تھا۔رباعیات کہنے والا انمول شاعر۔صادقین نے اپنی زندگی میں ہزاروں رباعیات لکھیں۔بے مثال شاعر۔بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ساٹھ کی دہائی میں اسے اندرون سندھ بالخصوص گڈانی رہنے کا موقعہ ملا۔صحرا،ریت اور ویرانی۔سینکڑوں میل پر محیط ریت صرف اور صرف کیکٹس کے پودے نظر آتے تھے۔یہ تمام مناظر،صادقین کی روح میں سرایت کر گئے۔صحرا کا ویرانہ اسکا اپنا نشان بن گیا۔کانٹے دار پودے،اسکے وجدان میں کانٹے ہی کانٹے بھر گئے۔صادقین اَمر ہو گیا۔اسکا تخلیقی سفر اس درجہ مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اسکو سمجھنا ہر انسان کے بس میں نہیں۔سورۃ رحمٰن کی خطاطی فن پاروں میں سے ایک ہے۔وجود اور عدم وجود کے درمیان سفر کرنے والا صادقین اپنے خیالات کو دیواروں،چھتوں اور تصویروں میں منتقل کرتا رہا۔لاہور کے میوزیم سے لیکر پنجاب یونیورسٹی تک،ہندوستان میں بنارس یونیورسٹی سے لیکر کراچی کے فریرے ہال تک،اسکے نایاب کام کے نمونے موجود ہیں۔صرف پاکستان نہیں،ابوظہبی کے ایک پاور سٹیشن کی چھت پر اسکا کام مکمل طور پر محفوظ ہے۔انسان کی جدوجہد،محنت اور انسان کے ذہن کی بلندی تمام فن پاروں کے اندر کسی نہ کسی طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔

صادقین کی زندگی میں دو آرٹ گیلریاں فن پاروں کو محفوظ رکھنے کیلئے قائم کی گئیں۔ایک اسلام آباد اور ایک کراچی فریرے ہال میں۔جیسے ہی صادقین اس دنیا سے روانہ ہوا،اسلام آباد کی گیلری بند کردی گئی۔وہاں سے دوسو کے لگ بھگ تصاویر چوری ہو گئیں۔فریرے ہال کے متعلق شروع میں عرض کر چکا ہوں۔آج صادقین کا یوم پیدائش ہے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پورے ملک کی آرٹس گیلریوں میں صادقین کیلئے خصوصی تقاریب منعقد کی جاتیں۔وزیراعظم،صدر اور وزراء اعلیٰ اسکے عظیم فن پاروں کو دیکھنے جاتے اور انکو بھرپور طریقے سے سراہتے۔ہر صوبے میں مصوری اور خطاطی کے نئے ادارے بنائے جاتے۔مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔وہی دقیانوسی سی سطحی باتیں اور پھر ایک تکلیف دہ خاموشی۔لوٹ مار کو اپنی دنیاوی اساس بنانے والے اس ملک میں صادقین جیسے عظیم مصور کا کام بھی خورد برد ہو چکا ہے۔اسکے فن پارے چوری ہونے کا کیا گلہ کریں۔یہاں تو لوگوں کی روحیں تک وقتی مالی فائدے کے عوض گروی رکھی جا چکی ہیں۔بیچارے صادقین کی یہاں کس کو ضرورت ہے؟

راؤ منظر حیات